محسنِ انسانیت ﷺ

(مخالفت کے طوفانوں سے گذرتے ہوئے)

اور اُجالا پھیلتا ہی گیا

——— جناب نعیم صدیقی صاحب ———

(بسلسلۂ گذشتہ)

مسلم کردار کی اخلاقی قوت کوئی دعوت بھی اگر صرف لفظی دعوت ہو اور اس کے ساتھ اخلاقی زور نہ ہو تو وہ کیسی زریں ہی کیوں نہ ہو اور تھوڑی دیر کے لئے دلوں پر کتنا ہی سحر کیوں نہ طاری کرے آخرکار دھوئیں کے مرغولوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ تاریخ پر الفاظ سے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا جا سکتا اور کھوکھلی زبان کبھی انقلاب نہیں اٹھا سکتی۔ الفاظ جبھی موثر ہوتے ہیں جبکہ عمل کے لغت کے رو سے ان کے کچھ معنی ہوں۔ زبان کا جادو صابن کے سے خوشنما جھاگ اور رنگین بلبلے پیدا کر سکتا ہے مگر یہ بلبلے کسی ایک ذرۂ خاک کو بھی اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتے اور ساتھ کے ساتھ مٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلیل جب کردار کے بغیر آئے، اپیل جب اخلاص سے خالی ہو۔ اور تنقید جب اخلاقی لحاظ سے کھوکھلی ہو تو انسانیت اس سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ کردار کی اخلاقی طاقت ہی کسی دعوت میں اثر بھرتی ہے۔ عمل کی شہادت کے بغیر زبان کی شہادت بے کار ثابت ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

اسلامی تحریک کی دعوت نری منطقی دعوت نہ تھی اور وہ اکیڈمک طرز کی نظریاتی بحثیں لے کے نہیں آئی تھی ——— وہ سراسر ایک پیغامِ عمل تھی اور ایک تحریکِ اقدام! وہ ایک خاص طرز

کا انسان بنانے آئی تھی۔ اور وہ انسان اس نے اوّل روز سے بنانا شروع کر دیا۔ اسی انسان کا طرزِ فکر، اسی کے اخلاقی اوصاف اور اس کا من موہنا کردار تھا جو اس کے دلائل کو حقیقی وزن، اس کی اپیلوں کو سچی جاذبیت اور اس کی تنقیدوں کو گہرا اثر دینے والا تھا۔ تحریکِ اسلامی کا انسان خود ایک محکم دلیل تھا، خود سب سے بڑھ کر موثر اپیل تھا اور اس کا پورا وجود پرانے نظام حیوانی ساخت کے انسان، فاسد جاہلی ماحول، جامد سماج اور اس کی نااہل قیادت پر ایک بھرپور تنقید تھا۔ جاہلیت کے پاس اس زندہ دلیل، اس زندہ اپیل اور اس زندہ تنقید کا کوئی جواب نہ تھا، اس کا کوئی توڑ نہ تھا، وہ اس کے مقابلے میں بالکل بے بس تھی۔ وہ نیا انسان کہ جس کا انتہائی معیاری نمونہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں دنیا کے سامنے تھا اور جس کے بیشمار پیکر اپنی اپنی سیرتوں کے چراغ اس قمرِ منیر کی شعاعوں سے روشن کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسی قطعی اور ٹھوس حقیقت تھا کہ اس سے آنکھیں بند کرنا بھی اس کی نورانیت پر ایک شہادت تھا۔ اس کا انکار کرنے، اسے ٹھکرانے اور اس سے ٹکرانے والے بھی اپنے رویّے سے اس کی عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ مکّہ میں اس انسان نے اپنی انفرادیت کی شان دکھائی تھی اور مدینہ میں آکر اس نے اپنی اجتماعیت کا جلوہ دکھایا

تحریکِ اسلامی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس نئے انسان کی تعمیر کے اصل کام سے کبھی غفلت نہیں برتی، دوسروں کی اصلاح کرنے کے جذبے میں اسے کبھی فراموش نہیں کیا اور دوسروں پر تنقید کرنے میں گم ہو کر اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے اور اس کی اصلاح کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ وہاں دوسروں کی اصلاح سے مقدم اپنی اصلاح تھی، دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ اہم اپنے اوپر تنقید کرنا تھا۔ باہر تبدیلی رونما کرنے سے پہلے اپنے اندر مطلوبہ تغیرات لانا ضروری تھا۔

ایک ایسے معاشرہ کے درمیان جس کی نگاہوں میں کمانے اور کھانے پینے سے زیادہ اونچا کوئی مقصد نہ تھا، جس کی ہر مجلس ایک میکدہ اور ایک قمار خانہ اور رقص گاہ تھی جہاں سجائی جاتی

کا استعمال دنگے فساد، قتل، انتقام در انتقام اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہ تھا اور جہاں تمدن ایک ایسے جنگل میں بدل گیا تھا جس کے کچھاروں میں انسانی درندے دھاڑتے رہتے تھے اور شریف اور مسکین لوگ ان کے لئے ستا شکار بنے ہوئے تھے ــــــ وہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب انسانیت کے ایک صالح قافلہ کو جلو میں لئے ہوئے نمودار ہوئے تو اس کا وجود اوّل روز سے ماحول میں انتہائی نمایاں تھا۔ لوگ انسانیت کے اس نئے نمونے کو اچنبھے سے دیکھتے اور اسے ہر پہلو سے مختلف اور ممتاز پاتے۔ پھر اس کی نشو و نما ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اور اس کے تعلیم و تزکیہ کا سارا کام از اوّل تا آخر عوام الناس نے خوب اچھی طرح دیکھا۔

خواص اور عوام ہر صبح اور شام دیکھتے تھے کہ کلمۂ اسلام یکے بعد دیگرے اچھے اچھے افراد کو کھینچتا چلا جاتا ہے، یکایک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ اٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس انقلابی تحریک کے سپرد کر دیتے ہیں، وہی جو پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دانتوں اور ناخنوں تک کا زور صرف کر کے لڑ رہے ہوتے ہیں اچانک وہی سر افگندہ ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ پھر جو کوئی بھی کلمۂ حق کو قبول کرتا ہے آناً فاناً اس کے ذہن و کردار میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کی دوستیاں اور دشمنیاں بدل جاتی ہیں، اس کی پہلی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں؛ پھر وہ معاً انتہائی فعّال اور سرگرم شخصیت سے آراستہ ہو جاتا ہے، اس میں ایک نئی طاقت ابھر آتی ہے، اسکی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں، اس کے ضمیر کا چراغ پوری لَو دینے لگتا ہے، اس کا احساس انگڑائی لیتا ہے، اس کے تخیل کو نئے بال و پر مل جاتے ہیں، اس کے سینے میں حسنِ خلق کی کلیاں ایک ایک کر کے چٹکنے لگتی ہیں، اور ان کی نکہت فضا میں پھیلتی ہے۔ جو شخص کافر سے مسلم بنتا تھا اس کے اندر سے گویا ایک دوسرا آدمی نمودار ہو جاتا، وہ خود بھی محسوس کرتا کہ میں اپنے ماحول سے کچھ مختلف اور بالکل نئی چیز ہوں اور ماحول بھی دیکھتا کہ وہ اب ویسا نہیں رہا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ ــــــــــــ قاتل آتے اور انسانی جان کے

محافظ بن جاتے، چور آتے اور امین بن جاتے، زانی آتے اور عفت و حیا کے پیکر بن جاتے لڑاکے آتے اور صلح و آشتی کے معلّم بن جاتے، کج خلق آتے اور حلیم اور متواضع بن جاتے، سود خوار آتے اور انفاق کرنے والے بن جاتے، کُند ذہن آتے اور ان کے اندر سے اعلیٰ قابلیتوں کے سوتے اُبل پڑتے، ادنیٰ سماجی مرتبوں سے اٹھتے اور شرف کی بلندیوں کو چھو لیتے، جیسے یہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بن گئے ہوں، جیسے یہ مٹی کے پُتلے نہ ہوں بلکہ کسی دوسرے جوہر سے انہوں نے وجود پایا ہو۔

یہ خدا کے پرستار، رسولؐ کے دیوانے، شمعِ صداقت کے پروانے، نیکی کے نقیب، بھلائی کے داعی، بدی کے دشمن، ظلم کے مخالف ——— یہ رکوع و سجود میں قرار پانے والے، یہ قرآن پڑھتے ہوئے گریۂ بے تاب میں کھو جانے والے، یہ دنوں کو مقصد کے لئے دوڑ دھوپ کرنے اور راتوں کو اللہ سے لو لگانے والے، مسکینوں کو کھانا کھلانے والے، مسافروں کی خبر گیری کرنے والے، یتیموں اور بیواؤں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والے، لہو و لعب سے بے تعلق، تعیشات سے مجتنب، فضول بحثوں سے کنارہ کش، سنجیدگی و وقار کے پیکر، شائستگی و سلیقہ کے مجسمے ——— اور یہ محفلِ ہستی میں اجنبی بن جانے والے لوگ، یہ اپنی ہی بستیوں میں رہ کر غریب الوطن! ——— آخر کیسے ممکن تھا کہ سارے عرب کی نگاہیں ان پر مرتکز نہ ہو جاتیں۔

یہ علمبردارانِ اسلام، جو بغیر کسی لوث کے ایک مشن کی خدمت میں ہمہ تن محو تھے، کسی معاوضے کے بغیر تحریک کے ہمہ وقتی کارکن تھے، دنیا کی بھلائی کے لئے اپنے مفاد کو بالکل بالائے طاق ڈالے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مقدس نصب العین کے لئے دماغوں کی کاوشیں، جسموں کی طاقتیں جیبوں کے مال اور وقت آنے پر اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں تک صرف کرنے والے لوگ تھے۔ نہ ان کو معاش کی فکر تھی، نہ تن بدن کا ہوش تھا نہ راتوں کی نیند کا خیال، نہ بیوی بچوں میں مگن رہنے کی مہلت، نہ کھیل تماشوں سے دل

بہلانے کی فرصت بلکہ ان کا پیشہ تھا تو وہی، مشغلہ تھا تو وہی، تفریح تھی تو وہی اور ذریعۂ آرام و سکون تھا تو وہی کہ سچائی کا بول بالا ہو۔ انہوں نے ہنستے مسکراتے مخالفوں کی گالیاں سنیں، بہادرانہ شان سے جبر کے وار سہے، خوشی خوشی فاقے کاٹے، روحانی مسرت کے ساتھ وطن چھوڑے، صبر کے موقع پر انتہا درجہ کا صبر دکھایا اور مقابلہ کرنے کا وقت آیا تو مضبوط ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ احد احد کہتے تپتی ریت پہ لوٹ گئے، وجد آفرین شعر پڑھتے پڑھتے سولیوں پر لٹک گئے۔ گھائل ہو کر گرے تو مائل پرواز روح جھوم کر پکار اٹھی!— "فُزْتُ بربِّ الکعبۃ" ربّ کعبہ کی قسم! میں تو مراد پا گیا! — یہ کردار ہو اور پھر بھی دنیا سرنگوں نہ ہو جائے!

اس مسلم کردار نے ہر موقع پر ایسی زریں مثالیں قائم کیں کہ زندگی کی پیشانی ان کے نور سے یوم آخر تک جگمگاتی رہے گی۔ اس کردار کے مربیؐ نے مقتل سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے قاتلوں کی امانتوں کی واپسی کا اہتمام کیا، اس کردار نے میدان احد میں ہندہ کے سر پہ تلوار رکھ کر اٹھالی کہ اسے ایک عورت پر تیغ آزمائی کرنا گوارا نہ ہوا، اس کردار نے زنا کا جرم سرزد ہو جانے پر بطور خود پیش ہو کر اقرار جرم کیا اور اسلامی عدالت سے باصرار انتہائی سنگین سزائے موت اپنے لئے قبول کی تاکہ خدا کے حضور میں پاک ہو کر پیش ہو سکے، اس کردار کو قبول اسلام کے چند ہی منٹ بعد جب ایک پیکر حسن نے دعوت عیش دی تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اب میں خدا و رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا، ایک جنگی سفر میں قبیلہ ازد سے فوج کا گذر ہوا تو ایک مسلمان سپاہی نے ضرورۃً وہاں سے ایک لوٹا لے لیا۔ لیکن یہ اس مسلم کردار کی شان تھی کہ باز پرس کی اور فوراً وہ لوٹا واپس کر دیا۔ ایسی صدہا مثالیں، نت نئی مثالیں جس انسانی ماحول میں نمودار ہوتی ہونگی۔ اس پر تو ہر روز زلزلہ طاری ہوتا ہو گا۔

کیا دنیا ان کا ایثار دیکھ دیکھ کر مبہوت نہ ہوتی ہوگی کہ انصار نے اپنے گھر بار اور

مال و منال آدھوں آدھ بانٹ کر مہاجرین کے سامنے رکھ دیئے ؟ کیا عوام کے دل اس مساوات کا سماں دیکھ کر کھنچتے نہ ہونگے کہ ادنیٰ ترین غلام خاندانی ہستیوں کے ساتھ اور غریب طبقوں کے افراد اہلِ ثروت کے ساتھ اور گھروں سے اُجڑ کر آنے والے لوگ مدینہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ صف واحد میں کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اہمیت حاصل ہے، ہر ایک کی عزت ہوتی ہے، ہر ایک کی رائے وزن رکھتی ہے، ہر ایک کو ذمہ داریاں اٹھانے اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک برادری ہے جس کے سارے افراد اچھے حالات میں بھی شریک رہتے ہیں اور تکلیف اور مصیبت میں بھی حصہ دار بنتے ہیں۔ بھوک کا دور ہے تو اس میں سے سب سے بڑا حصہ دار سوسائٹی کا قائد ہے، اور خوشحالی کا دور آتا ہے تو اس میں سے سب سے کم حصہ وہ اپنے لئے لیتا ہے۔ ان کے غم مشترک، ان کی مسرتیں مشترک! ان کا سوچنا مشترک اور ان کے اقدام مشترک!

جاہلی تصورات کے مطابق اونچے اور نیچے خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہونگے۔ رسم و رواج کی بوجھل بیڑیاں کاٹ کر سادہ معاشرت کا جو نہج نکالا گیا تھا اس کی طرف طبائع از خود کھنچتی ہونگی۔ کتنی محبت بھری زندگی تھی، کتنی ہلکی پھلکی، کتنی پرامن اور کتنی اطمینان بخش! ——— صحیح معنوں میں "حیاتِ طیبہ"!

پھر ماحول دیکھتا ہوگا کہ کیسی کیسی قابلیتیں ان لوگوں میں ابھر رہی ہیں۔ سچائی کے کلمے کی گھٹا جب کبھی کسی مقام پر برس جاتی ہے تو دلوں اور دماغوں کی سرزمین سے ایسی روئیدگی ہوتی ہے کہ بنجر فضاؤں میں گل و لالہ کے تختے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ سارا عرب اس جماعت کو دیکھ رہا ہوگا کہ جس میں بعض لوگ علوم میں ترقی کر رہے ہیں، بعض لوگ قانون میں ماہرانہ مقام حاصل کر رہے ہیں، بعض لوگ اچھے زراعت کار اور تاجر بن رہے ہیں، بعض لوگ اعلیٰ درجہ کے کمانڈر ثابت ہو رہے ہیں، بعض انتظامی مناصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل بن رہے ہیں، کچھ سفارت کے فرائض

انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر آدمی کے اندر سے ایک نئی شخصیت رونما ہو کر برگ و بار لا رہی ہے۔

اس کردار کی تصویریں قرآن نے کھینچ کھینچ کر بار بار مخالفین کو بھی اور عوام کو بھی یہ احساس دلایا کہ دیکھو انسانیت کا یہ نمونہ جو نظریۂ حق کے نور سے بنتا ہے کتنا افضل ہے۔ اور امن و سلامتی کا حصول اگر ممکن ہے تو اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کردار کو تحریکِ اسلامی نے اپنی دعوت کی سچائی پر دلیل بنا کر سامنے رکھا۔ پھر بار بار اس کردار کا تقابل جاہلی کردار سے بھی کیا، اہلِ کتاب کے کردار سے بھی کیا اور منافقین کے کردار سے بھی کیا۔ دونوں کو آمنے سامنے رکھکر دکھایا کہ دیکھو اور خود رائے قائم کرو۔ میدانِ واقعہ میں تو یہ تقابل از خود ہو ہی رہا تھا — اور زندگی کے ہر دائرے میں ہر ہر پہلو سے ہو رہا تھا۔

کشمکش کی حالت بہ یک وقت دو بڑے اثرات رکھتی ہے۔ کشمکش میں پڑ کر کردار بنتے بھی ہیں اور کشمکش میں پڑ کر ہی کردار تباہ بھی ہوتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی نے پورا پورا اہتمام کیا کہ مسلم کردار کشمکش میں پڑ کر اور نتھرے، اور سنورے، اور اچھی طرح پروان چڑھے۔ چنانچہ تلقین اور تربیت اور تزکیہ کے کڑے اہتمام کی وجہ سے مسلم کردار ترقی کرتا چلا گیا اور دوسری طرف جاہلی کردار کشمکش میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف لڑھکتا گیا اور آخر کار بالکل غارت ہو گیا۔ مسلم کردار کو بار بار صبر کا درس دیا گیا، اس میں برداشت کی قوت اور اپنے موقف پر جمے رہنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ کبھی تاکید کی گئی کہ اشتعال میں نہ آؤ، کبھی نصیحت کی گئی کہ فرزندانِ جہالت سے نہ الجھو۔ کبھی ہمت بندھائی گئی کہ ڈھیلے نہ پڑو، مایوسی کا شکار نہ ہو، کبھی سکھایا گیا کہ برائی کا جواب بھلائی سے دو اور زیادتیوں پر عفو و درگزر سے کام لو۔ کبھی تعلیم دی گئی کہ کسی گروہ کی دشمنی کے جذبے میں آ کر انصاف کی راہ سے نہ ہٹو۔ کبھی ہدایت دی گئی کہ دنیا پرستوں سے اصلاح کی امیدیں نہ لگاؤ اور ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ کبھی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی صف میں اہلِ جاہ و حشمت کو دیکھ کر ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو اور کبھی سبق

دیا گیا کہ نتائج تک پہنچنے کے لیے عاجلانہ ذہن سے کام نہ لو۔ اس کے ہر نفسیاتی آثار چڑھاؤ پر نگاہ رکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ ان کو فلاح کی راہ سمجھائی جاتی رہی۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جماعت کے ایک ایک فرد پر پوری طرح توجہ رکھی اور بہترین مواقع پر کبھی نصیحت سے، کبھی گرفت سے، کبھی زجر و توبیخ سے، کبھی ناراضی سے، کبھی اظہارِ خوشنودی سے کام لے کر مسلم کردار کو نشو و نما دی۔ جس میں جیسی صلاحیتیں دیکھیں اور مزاج کی جیسی ساخت پائی اس کو اسی کی ضروریات کے مطابق مشورے دیئے اور جس میں جس نوعیت کی کمزوری دیکھی اس کے سامنے دینِ حق کا ویسا ہی اخلاقی تقاضا بیان کیا۔ پھر اجتماعی عمل و اقدام کے دائرے میں مسلم جماعت نے جو کچھ طرزِ عمل دکھایا اس پر ہر اہم واقعہ کے بعد کڑی تنقید کی۔ بدر و احد کے معرکے ہوں یا صلح حدیبیہ کا معاملہ، تحویلِ قبلہ ہو یا واقعۂ افک، ہر اہم تاریخی واقعے کے بعد ایک طرف مخالفین کا طرزِ عمل عوام کے سامنے رکھ دیا اور دوسری طرف اپنی جماعت کا بے لاگ محاسبہ کر کے ساری کمزوریاں برسرِ عام واضح کیں اور ان کے انسداد کے لیے تدابیر بتائیں۔ دشمن کے خلاف اگر اپنے رفقاء کوئی غلط اقدام کر بیٹھے تو اس پر پردہ ڈالنے اور اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دشمن کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا۔ کوئی جان سہواً لی گئی تو اس کا خون بہا ادا کیا۔ واقعۂ نخلہ کے سلسلے میں اپنے رفقاء پر گرفت کی۔ حضرت خالدؓ نے کلمہ پکارنے والوں کو غیر مخلص سمجھ کر سہواً قتل کر دیا تو ان کے اس فعل سے برأت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ صورتِ واقعہ یہ نہ تھی کہ مسلم کردار (باستثنائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) معصوم عن الخطا تھا اور کسی سے کوئی سہو یا لغزش نہ ہوتی تھی، نہ اسے اس حیثیت سے پیش ہی کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مجموعی ساخت کے اعتبار سے پاکیزہ تھا اور اس میں قبولِ اصلاح کی استعداد اور نشو و ترقی کی صلاحیت تھی۔ وہ بہ حیثیت ایک کُل کے جاہلی کردار سے بیّن طور پر فائق و افضل تھا اور برابر پیشقدمی کر رہا تھا۔

کسی بھی جماعتی قیادت اور اپنے بنائے ماحول کا مقابلہ کرنا کوئی کھیل نہیں ہوتا۔ یہ کام بڑے کام ہوتے ہیں، ان میں بڑی مار کھانی پڑتی ہے اور بڑے ٹھنڈے جوش سے ان معرکوں کو سر کیا

جا سکتا ہے۔ ماحول کی قوت آگے بڑھنے والوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کے برابر کھینچتی رہتی ہے، اصلاح کرنے والوں کو از سرِ نو بگاڑ دینا چاہتی ہے، ان کے دلوں میں نفوذ کے لیے رخنے تلاش کر کر کے کوشاں رہتی ہے کہ اپنے سے عقیدوں، اپنی سی رسموں اور اپنی سی عادات کو کسی طرح پھر ان میں گھسا دے اور کوئی راہ ذہنی مصالحت کی نکال کر پیشقدمی کرے۔ ناسازگار حالات میں یہی کشمکش جب قوتوں کو مضمحل کر دیتی ہے اور ہمتوں کو تھکا دیتی ہے تو بڑے بڑے مخلص لوگوں کے قدم پیچھے کھسکنے لگتے ہیں۔ آدمی کچھ انقلابی قدروں کو چھوڑ کر پرانی قدروں کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اصول و اعتقاد میں نہ سہی، ثقافتی آداب و اطوار، رہن سہن، وضع قطع میں بیرونی اثرات قبول کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ بس اتنا سا راستہ کھل جائے تو پھر ماحول اسے آہستہ آہستہ فراخ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر اپنے سارے لوازم اندر گھسا لے جاتا ہے۔ تکمیلِ کار ایک نسل کے دور میں نہ سہی، اگلی نسل کے عہد میں سہی! مگر تحریکِ اسلامی نے مسلم کردار کو تعمیر کرتے ہوئے اس خطرے کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اسے بہت ہی آہنی ساخت دی اور تحفظ کی پوری تدابیر اختیار کیں۔ ایک طرف تو اسے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ یعنی مخالفوں کے مقابلے میں ایک مضبوط چٹان بنانے کے لیے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونے کا درس دیا اور دوسری طرف غیروں کی تقلید، غیروں سے مرعوبیت، غیروں سے رازدارانہ تعلقات اور بے تکلفانہ قرابت رکھنے سے بالکل روک دیا۔ یہی ذہنی استحکام جماعت میں پیدا کرنے کے لیے تو مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ اور اگر کسی جگہ معتدبہ افراد یکجا ہوتے تو ان سے بیعتِ اعرابی (یعنی ایسی بیعت جس سے ہجرت واجب نہ ہو) لی جاتی تو ان کو بھی یہ تاکید ضرور تھی کہ فَارِقُوا الْمُشْرِکِیْنَ یعنی اہلِ شرک سے برادری، دوستی، شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھو بلکہ اپنی سوسائٹی الگ اٹھاؤ۔ غیر مسلم والدین کی خدمت کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کڑا حکم بھی دیا گیا کہ اسلام سے انحراف کے لیے کہیں تو فَلَا تُطِعْھُمَا۔ اسلام کے خلاف کسی کی کوئی طاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس کردار کی شان یہ تھی کہ وہ نہ ایران کی پرشکوہ تہذیب سے متاثر ہوا اور نہ روم کے ٹھاٹھ دار تمدن کے سامنے اس کا دل پسیجا۔ وہ بڑے بڑے درباروں میں اپنی بدویانہ شان کے ساتھ قالینوں کو روندتا ہوا

بغیر اپنی گردن جھکائے پہنچا اور کہنے کی بات اس طرح کہی جیسے وہ بوتوں کے درمیان کھڑا بات کر رہا ہو۔ اس کردار کو جب ذہنی لحاظ سے اتنا مستحکم بنا دیا گیا اور ہر قسم کے احساس کہتری سے اسے بالاتر کر دیا گیا تو پھر اسے حریفوں نے میدانِ جنگ میں بھی پکارا تو اس نے شجاعت و استقامت کی زندۂ جاوید نظیریں قائم کر دیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ کردار قلتِ تعداد اور کوتاہیٔ اسباب کے باوجود نرم چارہ نہیں ہے بلکہ اس سے آویزش تو لوہے کے چنے چبانے کے ہم معنی ہے۔

اس مسلم کردار کے بے شمار کٹر مخالفین ہونگے جو اس کا طنز و استہزاء کرتے ہوئے دل ہی دل میں محسوس کرتے ہونگے کہ یہ ہم سے ہزار درجے افضل اور برتر ہے۔ بے شمار حریف ظاہراً مخالفت کرنے کے باوجود باطن میں رشک کرتے ہونگے کہ کاش کہ ہم بھی ایسے ہوتے اور ہم بھی اس برادری میں شامل ہوتے۔ اس کردار کو گالیاں دینے والے، اس کی ہجو کرنے والے اور اس کے خلاف پروپگینڈا کرنے والے کبھی کبھی لمحۂ فکر میں پڑ کر آپ سے آپ کہتے ہونگے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ چنانچہ بے شمار مواقع پر مخالفین نے زبانوں سے بھی اپنا دلی اعتراف بیان کر دیا۔ معرکۂ اُحد کے خاتمہ پر جب پہاڑی پر کھڑے ہو کر ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا محمدؐ قتل ہو گئے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "بخدا! وہ زندہ ہیں اور تمہاری بات سن رہے ہیں" تو ابوسفیان نے کہا کہ اگرچہ ابن قمیہ کہتا ہے کہ میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا مگر ہم تم کو اس سے زیادہ سچا سمجھتے ہیں۔" اسی طرح معاہدۂ حدیبیہ سے قبل عروہ بن مسعود سفیرِ قریش نے مسلم جماعت کا جو منظر دیکھا اسے جن لفظوں میں اکابرِ قریش سے بیان کیا وہ اس تاثر کے گواہ ہیں جو اغیار پر برابر پڑ رہا تھا۔ اسی طرح قیصر کے دربار میں ابوسفیان نے جو بیان اسلام کا مخالف ہونے کے باوجود حضورؐ اور آپ کی تحریک کے بارے میں دیا وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دشمنی کرنے والے بھی محمدؐ اور اسلام کی عظمت کا اعتراف رکھتے تھے۔ مدینہ کا تحصیلدار خیبر کے یہودیوں سے وصولی کرنے جاتا ہے تو اس کی تقسیم کی صحت دیکھ کر وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہی عدل ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔

آئے دن عرب کے کونے کونے میں تو خیر مسلم سوسائٹی کے اندر کے احوال کے چرچے ہوتے ہونگے۔

اس کے افراد کے تذکرے رہتے ہونگے۔ لوگوں کی نگاہیں مدینہ پر لگی رہتی ہونگی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہونگے کہ آج تاریخ میں نیا مدوجزر کیا واقع ہوا۔ مسافروں اور قافلوں کے ذریعے روزمرہ احوال کی اطلاعات دُور دور تک پھیلتی ہونگی اور لوگ ہر آمد و رفت سے دریافت کرتے ہونگے کہ کوئی نئی بات سنائو۔ گویا مدینہ کی ہر بات میں حد درجہ کی "خبریت" (NEWS VALUE) پیدا ہوگئی ہوگی۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے ہونگے محمدؐ اور مسلم سوسائٹی اور اسلامی تحریک اور مدینہ کی حکومت گفتگو کے اوّلین موضوع ہوتے ہونگے، عورتیں مل بیٹھتی ہونگی تو مدینہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ہونگی، ماں باپ بچوں کو "خوش کرنے"، بہلانے اور ڈرانے کے لیے نہ جانے مدینہ کے واقعات سے کیا کیا مواد لیتے ہونگے۔ ہوا کا ہر جھونکا اس مسلم کردار کی خوشبو لیے لیے نخلستانوں اور صحراؤں اور چشمہ گاہوں سے گذرتا ہوگا۔

اسلامی تحریک کی یہ اخلاقی قوت ہی اس کی دلیل اور اپیل کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے والی تھی۔ اور یہ مسلم کردار کی عظمت کا اعتراف تھا جس نے لاکھوں دلوں کو مسخر کر لیا۔ یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے کہ کس طرح اسلام کا مقناطیس ہر چہار جانب سے بکھرے ہوئے ذراتِ انسانیت کو اپنی طرف کھینچتا چلا گیا۔

پہلے مکہ کے دَور کو لیجیے۔ مشہور شاعر طفیل دوسی آتا ہے اور قریش اسے حضورؐ سے ملنے سے باز رکھتے ہیں۔ آخر وہ خود جا حاضر ہوتا ہے اور قرآن کی چند آیات سُن کر محض ان کے اثر سے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ عمرو بن عبسہ حضورؐ کا چرچا سن کے آتے ہیں اور اسلام دل میں جگہ پا لیتا ہے حضورؐ کے بچپن کے ساتھی ضماد بن ثعلبہ ناصح اور چارہ گر بن کے آتے ہیں مگر زبانِ مبارک سے خدا کی حمد کے چند بول سُن کر ہی مفتوح ہو جاتے ہیں۔ ایک صحرائی قبیلہ جس کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے اس کا ایک نوجوان ابوذرؓ اسلام کا چرچا سن کے آتا ہے اور مخالف ماحول سے بچ بچ کر حضورؐ تک پہنچتا ہے دعوت سنتا ہے اور تحریکِ حق کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اس میں یکایک ایک ایسا جذبہ اٹھتا ہے کہ وہ حرم میں جا کر کلمۂ حق کا اعلان کرتا ہے اور پھر اس جُرمِ عشق کی تعزیر کا مزہ چکھتا ہے۔

پھر جو جو شخص تحریک اسلامی کے حلقہ میں داخل ہوتا گیا وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں خود ایک داعی بنتا گیا۔ بعض کے اثر سے قبیلے کے قبیلے اسلام کو قبول کرتے گئے۔ سوید بن صامت حضورؐ سے ملاقات کرتا ہے اور گہرا اثر لے کے جاتا ہے۔ ایاس بن معاذ مدینہ سے آکر حضورؐ کی دعوت کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر مدینہ میں نظامِ حق کی طلب پیدا کرتا ہے۔ نجران سے ۶۰ عیسائیوں کا وفد آکر حضورؐ سے اسلام کے پیغام کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور باوجودیکہ قریش ان کو ورغلاتے ہیں، یہ لوگ حق کی روشنی کو سینوں میں جذب کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ مہاجرینِ حبشہ سے یمن کے لوگ متاثر ہو کر اسلام کو سینوں میں جگہ دیتے ہیں اور انہی کے ذریعے شاہِ نجاشی کا دل ایمان سے منور ہو جاتا ہے۔

مدینہ میں اوس و خزرج کے لوگ تو حضورؐ کی آمد سے پہلے ہی تیزی سے اسلام میں آ رہے تھے اور حضورؐ کے ہجرت کر کے آجانے کے بعد تو کوئی گھر خالی نہ رہا جس میں اسلام کی روشنی نہ جا پہنچی ہو۔ حیرت ناک یہ تھا کہ یہود کا ایک عالم عبداللہ بن سلام حضورؐ کے ایک سادہ سے خطاب (ایھا الناس! افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا باللیل والناس نیام) کو سن کر قریب آجاتا ہے اور تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ کر کے سرورِ عالم کی خدمت میں شہادتِ حق ادا کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں میں سے ایک نامور راہب و عالم ابو قبیس صرمہ بن ابی انس تحریک اسلامی کی پکار پر لبیک کہتا ہے۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو چھڑانے آئے تھے اور حضورؐ کی زبان سے چند آیات کو توجہ سے سننے کا موقع ملا حقیقت ایسی منکشف ہوئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے دل پرواز کر گیا ہے۔

قریش کے غلام ابو رافع مکہ کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ آئے تو سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔ واپس جانے پر تیار نہ تھے۔ حضورؐ نے سمجھایا کہ سفیر کو روکا نہیں جا سکتا تم واپس جاؤ اور پھر اسلام کی کشش ادھر کھینچے تو مدینہ آجاؤ۔ چنانچہ وہ مکہ گئے اور واپس آکر اسلامی جماعت میں شریک ہو گئے۔

بنو قریظہ کے خلاف ان کے جرائم کی سزا دینے کے لیے چڑھائی ہوتی ہے تو اس عالم میں ان کا ایک فرد عمرو بن سعدا اسلام قبول کرتا ہے۔ ثمامہ بن اثال حنفی رئیسِ یمامہ قید ہو کر آتا ہے اور حضورؐ

کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اسلامی جماعت کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ غزوۂ احد برپا ہے کہ عمرو بن ثابت المعروف (بنی عبدالاشہل) عین اسی لمحے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے سیدھے معرکۂ کارزار میں شریک ہو جاتے ہیں اور شہادت سے فائز ہوتے ہیں۔ معرکۂ خندق کے کٹھن حالات میں نعیم بن مسعود تحریکِ اسلامی کے قدموں میں آ گرتے ہیں۔ ابوالعاص مدینہ آتے ہیں تو بالکل غیر متوقع طور پر اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ خیبر کے یہود کو جنگی تیاریاں کرتے دیکھ کر ان کا ایک چرواہا اسود معلوم کرتا ہے کہ کس سے جنگ ہے اور کیوں ہے۔ پھر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تیاریاں ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو وہ جذبۂ بے تاب لیے حاضر ہوتا ہے اور حقیقت معلوم کرتا ہے اور پھر مفتوح ہو جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ اور عمرو بن عاصؓ جیسے ممتاز افراد (صلح حدیبیہ اور جنگ موتہ کے درمیان) یکایک قریش سے ٹوٹ کر اسلامی ریاست کے ساتھ آ ملتے ہیں۔ جاہلیت کے محاذ سے لڑتے لڑتے اندر سے دل اُکتا چکے تھے، سو یکایک ان کو تحریکِ اسلامی نے کھینچ لیا۔ فضالہ فتح مکہ کے موقع پر اور شیبہ بن ابی طلحہ معرکۂ حنین کے موقع پر حضورؐ کے قتل کے ارادے کر کے پہنچے، مگر خود ہی تیغِ حق سے گھائل ہو گئے۔ وفد ہوازن و بنو سعد کے آنے پر حضورؐ نے مالک بن عوف کو یاد کیا اور خواہش کی کہ وہ اسلام لائیں۔ پیغام پہنچنے پر مالک بن عوف ثقیف سے چھپ کر اگلے ہی دن حاضر ہو گئے اور اسلامی محاذ پر آ گئے۔ قبیلۂ طے پر اسلامی دستہ نے فتح پائی تو حاتم کی بیٹی قیدیوں میں مدینہ لائی گئی۔ اُس نے حضورؐ سے حُسنِ سلوک کی درخواست کی جسے قبول فرما کر آپؐ نے اسے سواری کا انتظام کر کے واپس بھیج دیا۔ اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم کو جس کے دل میں اسلام کے خلاف غصہ کی آگ مشتعل تھی، سارا حال سنایا اور مدینہ حاضر ہونے کی تلقین کی۔ عدی آیا اور آ کر بچشم خود حالات کا پورا جائزہ لیکر جب محسوس کر لیا کہ حضورؐ خدا کے سچے نبی ہیں تو حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ کعب بن زہیر جس نے حضورؐ اور تحریکِ اسلامی کے خلاف شاعری کا محاذ کھول رکھا تھا، از خود مدینہ آیا اور عرض کیا کہ تائب ہو کر مسلمان ہوا ہوں، امان دیجیے۔ امان مل گئی۔ پھر اس نے وہ قصیدہ (بانت سعاد) پڑھا۔ جو تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ عبداللہ ذوالبجادین کو دیکھیے کہ یہ بھولا بھالا

نوجوان مدینہ سے چلنے والی نسیم کے جھونکوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر چچا کے ڈر سے اپنے ارمان کو سینے میں کچھ عرصہ دبائے رکھتا ہے۔ چچا سے مایوس ہو جاتا ہے تو چچا، اس کے مال و جاہ اس کے دیئے ہوئے لباس اور گھر کے ماحول کو سلام وداع کہہ کر کمیل پوش بنا ہوا مدینہ پہنچتا ہے اور زندگی اسلامی تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ بحرین کے قبیلہ عبدالقیس کے ایک تاجر منقذ بن حبان کاروباری سفر پر نکلے۔ مدینہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں کچھ وقت کے لیے ٹھہرے۔ حضورؐ کے پیش نظر یہ نقشہ کار تو رہتا ہی تھا کہ بیرونِ حجاز کے علاقوں سے رابطہ بڑھانے کے ذرائع پیدا ہوں اور کام کے آدمی وہاں بھی تحریک کو حاصل ہوں، اس لیے اطلاع ملتے ہی خود تشریف لے گئے۔ دعوت پیش کی اور منقذ نے قبول کی۔ گھر گئے تو بحث و تمحیص کے بعد ان کے والد بھی حلقۂ اسلامی میں آ گئے۔ بعد میں قبیلہ کے عام لوگوں نے بھی ان کی مساعی سے اسلام قبول کیا۔ متعدد لوگوں نے بادشاہتیں، سیادتیں اور عہدے چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی عبودیت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوتِ حق کی کھیتی کس طرح اگ رہی تھی۔ آج یہاں بیج پھوٹا، کل وہاں سے تخمِ اخلاص نے کونپل نکالی، صبح اِدھر کوئی کلی چٹک گئی، شام اُدھر کسی کھوے نے آنکھ کھولی۔ جیسے شام کو آسمان پر تارے ٹمٹماتے ہیں، پہلے ایک، پھر دو چار، پھر دس بیس، پھر سو پچاس، پھر ہزاروں لاکھوں بلکہ اَن گنت۔ گویا ریت کے ذرّے خوابِ جمود سے ایک ایک کر کے چونک رہے تھے، ایک نے انگڑائی لی، دوسرے نے سر اٹھایا، تیسرے نے حرکت کا آغاز کیا، چوتھے نے آنکھ کھولی اور پھر جیسے وہ کرنوں کے پَر لگا کر اڑنے لگے، اڑ کر باہم گلے مل گئے اور ان سے ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔

ہم قبولِ اسلام کی تیز رفتار عوامی رَو کا ذکر تو بعد میں کریں گے جو ایک خاص مرحلہ آنے پر چلی اور لوگ جوق در جوق خود آگے بڑھ بڑھ کر تحریک کے دھارے میں بہتے چلے گئے۔ یہاں ہم ان خواص کا ذکر کر رہے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں پیش رو نکلے۔ ایسے لوگوں میں جب کوئی ایک بھی مسلم بن جاتا تو پھر وہ اپنے قبیلے اور اپنے علاقے میں خود ایک داعی و معلم بھی ہوتا،

اس کی ذات میں تحریک کا ایک مقامی مرکز کھل جاتا ۔ وہ اپنے قول اور اپنے کردار سے کتنے ہی دوسرے ساتھیوں کو ۔۔۔ بسا اوقات پورے کے پورے قبیلوں کو ۔۔۔ اسلام کی بارگاہ میں لا پیش کرتا۔ علاوہ ازیں خود مدینہ کے مرکزِ دعوت کی سرگرمیاں بھی اور اس کے علاقائی کارکنوں کی کوششیں بھی بے شمار ایسے آدمی پیدا کرتی جاتیں جو اگرچہ براہِ راست اسلامی تحریک کے حلقہ میں فوراً شامل نہ ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا رویّہ اختیار کر لیتے اور ایسے لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں بھی اپنی جگہ بڑا کام کرتیں ۔ ایسے حامیانِ تحریک غیروں اور مخالفوں میں بھی بیٹھ کر بات کر سکتے تھے اور ان کی بات سننے میں کسی طرح کا تعصب حائل نہ ہوتا ۔ ایسے لوگ قریشِ مکّہ کے درمیان بھی بکثرت تھے ، یہودیوں میں بھی تھے اور بدوی قبائل میں بھی ۔ ایسے ہی افراد تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو معاہدہ کرنے کے لیے تیار کیا ۔ ایسی ہی ایک شخصیت تھی جس نے جنگ احد کے بعد ابوسفیان کو پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے سے روکا ۔ ایسی ہی ایک شخصیت وہ بھی تھی جس نے حضورؐ کے زمانۂ نظر بندی میں شعب ابی طالب کو جانے والے غلّہ کو رکوانے کی مخالفت کی ۔ اور ایسی ہی شخصیتیں تھیں جنہوں نے سرے سے بائیکاٹ کے اس ناپاک معاہدے کو ختم کرایا جو حضورؐ کے خاندان کے خلاف باندھا گیا تھا ۔ ایسی ہی ایک شخصیت مخیرِ یق یہودی کی بھی تھی جس نے یہودی ہوتے ہوئے اپنی جان تحریکِ اسلامی کی حمایت میں لگا دی اور دوسرے یہودیوں کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی ۔ غرضیکہ اسلام لانے والی تعداد کے ارد گرد ایک بڑا حلقہ ایسے حمایتیوں کا بھی ہر جگہ بنتا گیا اور وہ بھی تحریک کے فروغ کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس عنصر کا بھی اسلام کے لیے راستے ہموار کرنے میں بہر حال حصّہ رہا ہے اور اس میں سے بیشتر لوگ بعد میں داخلِ اسلام ہونے کی سعادت سے بہرہ مند بھی ہوئے ۔ غرضیکہ اسلامی انقلاب کے نقیبوں کا ایک جال سا سارے عرب میں از خود پھیلتا چلا گیا ۔ مدینہ ان سب کے لیے مرکزِ تحریک تھا جس سے قوت حاصل کر کے ہر طرف پھیلے ہوئے حق پرست کلمۂ اسلام کی برقی رَو اپنے اپنے ماحول میں دوڑا رہے تھے ۔ مدینہ گویا دھڑکتا ہوا دل تھا جس سے افکار و جذبات

خون کی موجوں کی طرح عرب کے کونے کونے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک سورج تھا اور اس کے گرد دور دور تک پھیلے ہوئے اجرام روشنی حاصل کر کر کے فضاؤں کو منور کر رہے تھے۔

یہاں ہم سرسری طور پر اس کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو گا کہ ایک یا چند افراد نے کس طرح پورے پورے قبیلوں یا علاقوں کو متاثر کر لیا۔ ایک مثال تو خود مدینہ ہی کی ہے اور شاید سب سے بڑی اور شاندار مثال ہے۔ ایک نوجوان سوید بن صامت مکہ جا کر رسولؐ خدا سے کلمۂ اسلام کی روشنی حاصل کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سی تعداد متاثر ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ مدینہ اسلامی تحریک کا مرکز بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ طفیل دوسی اپنے مزاج کی وجہ سے اگرچہ قبیلہ کو جلد متاثر نہ کر سکے لیکن ان کی وجہ سے یمن میں تحریکِ اسلامی کا تعارف ہو گیا اور مہاجرین حبشہ سے متاثر ہو کر قبیلۂ اشعر نے کسی خارجی تحریک کے بغیر اپنے آپ کو اسلام کے محاذ پر پیش کر دیا۔ ضماد بن ثعلبہ کی دعوت سے پورا قبیلہ ازدشنوءہ حلقۂ اسلام میں آگیا۔ حضرت ابوذر غفاری اسلامی نظریۂ انقلاب کی روح سے سرشار ہو کر مکہ سے لوٹے تو ان کی دعوت سے ان کا آدھا قبیلہ نظامِ حق کا علمبردار بن گیا اور بقیہ آدھا حضور کے مدینہ جانے پر مسلمان ہوا۔ پھر اسی قبیلہ غفار کے اثر سے قبیلۂ اسلم میں بھی اسلام نے نفوذ کیا اور آہستہ آہستہ یہ پورا قبیلہ بھی جاہلیت سے کٹ کر اسلامی انقلاب کا علمبردار بن گیا۔ منقذ بن حیان مدینہ سے صداقت کا نور جذب کر کے اپنے وطن بحرین پہنچے تو دعوتِ حق کا کام شروع کر دیا اور لوگ متاثر ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ ہم مسلک رفیقوں کا وفد لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔ غرضیکہ بات وہی انجیل کی سامنے آتی ہے کہ خدائی بادشاہت (دعوتِ حق) کی مثال خمیر کی سی ہے کہ ایک عورت نے ذرا سا خمیر آٹے میں ملایا اور وہ سارے کا سارا خمیر ہو گیا۔

جہاں کہیں اسلام پہنچتا اور مناسب تعداد متاثر ہو جاتی، وہاں لازماً مسجد کی بنا ڈالی جاتی۔ مسجد صرف ایک عبادت گاہ ہی کی حیثیت نہ رکھتی تھی بلکہ وہ اسلام کا تمدنی مرکز ہوتی تھی اور بیک وقت تعلیم گاہ، دارالمشورہ، سماجی اجتماع گاہ اور مہمان خانہ کا کام بھی دیتی تھی۔ مسجد در حقیقت

اسلامی تحریک کی ایک کمیونٹی علامت (SYMBLE) ہوتی تھی اور علاقہ بھر میں مسجد کا وجود اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ یہاں اسلام پہنچ چکا ہے۔ اسی لیے حضورؐ ایک طرف نو مسلم قبائل کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ مسجدیں بنائیں اور دوسری طرف فوج کو حکم تھا کہ جہاں کہیں مسجد دکھائی دے اور جس بستی سے اذان کی پکار گونجے وہاں تلوار کبھی حرکت میں نہ لائی جائے۔ یہ گویا مزید ترغیب تھی تعمیرِ مساجد کی۔ لوگ اپنے نئے انقلابی مسلک کا اعلان و اظہار کرنے کی ایک مناسب شکل یہی پاتے تھے کہ بستی میں مسجد بنائیں اس سے اذان کے پیرائے میں تحریک اسلامی کے عقیدوں کا اعلان کریں اور اس میں نظامِ نماز قائم کر کے اجتماعیت سے بہرہ مند ہوں۔ حضورؐ کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ خود مدینہ میں آپؐ کے حینِ حیات میں نو مسجدیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ایک مسجد اوائل ہی میں بحرین میں بھی موجود تھی۔ اور مسجد نبوی کے علاوہ سب سے پہلا جمعہ اسی مسجد میں ادا ہوا۔ مساجد جہاں عوامی ادارات کی حیثیت رکھتی تھیں وہاں انہیں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوتی تھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو کسی علاقے یا بستی میں سول افسر بنا کر بھیجا گیا وہی وہاں کی مسجدوں کے امامِ صلوٰۃ بھی ہوتے تھے۔ جو قبائل مدینہ کے ایڈمنسٹریشن سے باہر ہوتے ان کی مسلم آبادی امام کے تقرر کے لیے حضورؐ سے مشورہ لیتی اور پھر حضورؐ کے بتائے ہوئے معیار پر خود کسی آدمی کا انتخاب کر لیتی۔ بہت سی مسجدیں ان تمام تاریخی مقامات پر تعمیر ہوئی ہیں جہاں حضورؐ نے کسی غزوہ یا سفر میں قیام کیا یا نماز ادا فرمائی یا کوئی اہم واقعہ رونما ہوا۔